تصریحات

سیرتِ نبوی کے چند روشن پہلو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض ولم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شیء فقدرہ تقدیرا والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبدہ ورسولہ محمد الذی ارسلہ بالحق بشیرا ونذیرا، وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا، وعلیٰ الہ و اصحابہ واتباعہ الذین اھتدوا بہدیہ وساروا فی سبیلہ سیرا حثیثا۔ امابعد،

سیرتِ نبویؐ کا موضوع نہایت جامع اور وسیع الاطراف موضوع ہے۔ اس کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا سوانحی خاکہ پیش کیا جائے۔ پھر آپؐ نے جس تاریک ماحول سے معاشرۂ انسانی کو نجات دلا کر اسے ایک روشن اور تابناک شاہراہ پر گامزن کیا تھا، اس کا مرقع سامنے لایا جائے۔ اس ضمن میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ جاہلیت کی رسوم و روایات میں جو کجی، ضرر اور فطرت سے بغاوت تھی اور ان سب کا جو سرچشمہ تھا اس کی نشاندہی کی جائے اور جس حکمت و دانائی سے اسے بند کیا گیا اور جن محکم بنیادوں پر ایک صالح معاشرہ وجود میں لایا گیا، ان کی رعنائی و زیبائی کا جلوہ بھی دکھایا جائے اور یہ بھی کہ نبوت کے جلال و جمال کے پرتو کی وسعتوں اور پہنائیوں کا مشاہدہ کرایا جائے۔ غرض تقاضے بے شمار ہیں اور دامنِ بیان تنگ ہے

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین تو از تنگیٔ دامان گلہ دارد!

ان تقاضوں کے لیے ایک مقالہ کیا ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ اس لیے میری کوشش ہوگی کہ انوارِ نبوت کے صرف چند ٹکڑے اور حیاتِ مبارکہ کے صرف چند جلوے مشتاقانِ دید کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دوں۔ ممکن ہے اس سے ہماری شاہراہِ عمل روشن ہو جائے اور ہمیں اپنی سعادت و خوش بختی اور عزم و کامرانی کے دروازے کھولنے کی توفیق مل جائے۔

جس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا، دنیا گمراہی و تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، کہیں کہیں اخلاق و کردار کے بعض اچھے پہلو رہ بھی گئے تھے تو تاریکی کی زد میں آکر ان کی رعنائی بھی مجروح ہو گئی تھی۔

خرابیوں کی اصل جڑ یہ تھی کہ انسان اپنے مقصدِ وجود سے اور حیثیت و مقام سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ انسان کا مقصدِ وجود سادے لفظوں میں یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ اور فرمانبردار بن کر زندگی گزارے اور اپنے آپ کو اس کی مرضی کے حوالے کر دے۔ انسان کا مقام یہ ہے کہ وہ اس کائنات کا خادم نہیں مخدوم ہے۔ یہ دنیا اپنے تکوینی نظام میں عملاً ایسے قانون کی پابند ہے جس سے انسانوں کی گوناگوں ضروریات پوری ہو رہی ہیں، اسے فائدہ پہنچ رہا ہے اور اس کی خدمات انجام پا رہی ہیں۔ انسان جب اپنے مقصد اور مقام سے ہٹ جاتے تو اس کا تارِ حیات اس طرح الجھ جاتا ہے کہ صدیوں سلجھانے کے باوجود سلجھ نہیں پاتا، بلکہ مزید پیچیدہ ہی ہوتا جاتا ہے، تاوقتیکہ وہ اپنے مقام پر پلٹ نہ آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہی صورتحال برپا تھی۔ دنیا خیر کے جذبات اور خدا کی پرستش سے خالی نہیں ہو گئی تھی، خدا کو مانتی تھی اور جن مذاہب کی پیرو تھی ان میں خدائی تعلیمات اور پیغمبرانہ ہدایات کے عناصر موجود تھے لیکن فساد یہاں سے پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ کے ساتھ انسان کا تعلق اور ربط صحیح دائرے میں نہیں رہ گیا تھا۔ انسان نے اللہ کے علاوہ کچھ دوسری مقدس ہستیوں مثلاً فرشتوں، پیغمبروں، ولیوں، بزرگوں، نیکوکار انسانوں اور اپنی تاریخ کے دیومالائی پرکھوں کے بارے میں یہ تصور کر لیا تھا کہ خدا کے قرب کے سبب انہیں بھی خدائی تصرف کے بعض جزوی اختیارات مل گئے ہیں اور خدا

اُن کی سفارش رد نہیں کرتا۔ اس تصور کی بنا پر یہ لوگ روزی، اولاد، شفا وغیرہ بہت سارے مقاصد کے لیے بلکہ عام طور پر اپنی ہر طرح کی حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے ان ہستیوں کو پکارتے، ان سے دُعائیں اور التجائیں کرتے، ان کی دہائیاں دیتے اور فریاد کرتے اور اُن سے مرادیں مانگتے۔ مہمات میں انہی پر توکل اور بھروسہ کرتے، ان سے امیدیں وابستہ رکھتے۔ ان کی ناراضگی کے خوف سے تھراتے اور انہیں راضی کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے۔ نیاز مندی و عاجزی کے ساتھ ان کی قبروں، آستانوں یا اُن کے نام پر بنے ہوئے بتوں کے سامنے جھکتے، سجدہ کرتے، نذریں اور قربانیاں پیش کرتے، چڑھاوے چڑھاتے۔ کھیتی اور جانور کی پیداوار اور تجارت کی آمدنی میں ان کا حصہ لگاتے۔ پھر ان ہستیوں کے ساتھ ساتھ ان کی قبروں اور آستانوں کے در و دیوار، درخت، پتھر وغیرہ سب ہی مقدس قرار پا گئے۔ اس عمل نے انسان کا تعلق اللہ سے کاٹ دیا اور انسانیت کے مقام بلند سے اس درجہ گرا دیا کہ جو مظاہر فطرت اس کے خادم تھے۔ اب وہی مخدوم و مسجود بن گئے اور یہ خرابی ایسی تھی کہ یہیں تک محدود نہ رہ سکتی تھی بلکہ یہ وہ ظلم عظیم تھا، جس کے فساد سے حیاتِ انسانی کے تمام ظاہر و باطن پہلوؤں کا متاثر ہونا ضروری تھا اور ہر شعبے میں اس کے کڑوے کسیلے پھلوں کی نمود لازمی تھی۔

چنانچہ جب اس شرک کا رواج ہوا تو مذہبی دُنیا میں سجادہ نشینوں، مجاوروں، کاہنوں، پنڈتوں، مہنتوں اور سربراہ پجاریوں کی پوری ایک کھیپ وجود میں آگئی جو ان ہستیوں تک درخواستیں اور مرادیں پہنچانے کی اجارہ داری بن بیٹھی اور اس کام کے پردے میں اپنی شکم پروری کے لیے نذر، قربانی اور چڑھاوے کے طریقوں، مواقع اور مقدار کی پوری ایک شریعت ایجاد کر ڈالی شادی، بیاہ، پیدائش، موت، صلح، جنگ، سفر پر روانگی، واپسی، دوستی، دشمنی، بیماری، تندرستی، صنعت، حرفت، تجارت، زراعت، غرض کاروبار زندگی کا کوئی شعبہ بھی نذر و نیاز کی ادائیگی کے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔ فال گیری اور بتوں سے استصواب کرانے، کاہنوں سے کام کا مناسب وقت پوچھنے، دعائیں کرانے، توہمات کی زد میں آکر جھاڑ پھونک کرانے، تعویذ گنڈے لینے، آسیب اور جن بھوت اتروانے جیسی بیسیوں خرافات تھیں جن میں انسان اپنی گاڑھی کمائی "دین و مذہب" کے ان اجارہ داروں پر خرچ کرتا تھا اور یہ اپنی ہوس زرگری کے لیے طرح طرح کے مواقع ایجاد کرتے اور مقدس ہستیوں کے بارے میں عجیب عجیب انکشافات کرتے رہتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے دُنیا پرست احبار و رہبان چند قدم اور آگے تھے وہ شریعت سازی

کے علاوہ گناہ بخشنے اور جنت کے ٹکڑے الاٹ کرانے کی پاور بھی حاصل کیے بیٹھے تھے۔

جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ معاملہ شرک و بت پرستی اور مذہب کے نام پر خدا اور بندے کے درمیان وسیلہ بننے کا ہو یا خدا کے وجود کا کلی انکار کر کے انسانوں کے لیے آزادانہ قانون سازی اور طریقہ حیات کی دریافت کا۔ اس معاملے میں جب بھی انسانوں کا کوئی گروہ بقیہ انسانوں کا اجارہ دار بنے گا اپنی خود غرضی، ہوس پرستی اور ستم پروری کے لیے اسی طرح کی عیاری، مکاری اور ہوشیاری سے کام لے کر انسانوں کا استحصال کرے گا۔

بہرحال ایک طرف تو انسان خرافات اور توہمات کے جہاں میں پھنس کر مذہبی اجارہ داروں کے لادے ہوئے بوجھ تلے کراہ رہا تھا، لیکن دوسری طرف وہ چند مقدس ہستیوں کو اپنا کارساز سمجھ لینے اور نذرانوں کی شکل میں انہیں راضی رکھنے کا پیٹنٹ اور اچوک نسخہ جان لینے کے بعد اخلاقی و اجتماعی معاملات اور حلال و حرام کے سلسلے میں بالکل بے لگام ہو گیا۔ بس یہیں سے ہمہ گیر برائیوں کا سیلاب پھوٹا اور خیر و شر کی تمیز جاتی رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اس فساد کا جو طوفان بپا تھا اس کا مکمل نقشہ پیش کرنا تو مشکل ہے چند جزوی اشارے پیش خدمت ہیں:

۱۔ اس وقت تعلق باللہ، تہذیب نفس اور تزکیۂ باطن کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ اگر کہیں تھا بھی تو نہایت کریہہ اور غیر فطری شکل میں۔

۲۔ اخلاق میں حد درجہ گھٹیا پن اور گراوٹ آ گئی تھی۔ خود غرضی، جھوٹ، فریب، بد عہدی کی فضا عام تھی۔ بد گوئی اور فحش کلامی فخر کے ساتھ کی جاتی تھی۔ ہمدردی، مروت، غمگساری اور انسانیت دوستی کے جذبات عنقا تھے۔ غرور، تکبر اور برتری کی ریس جاری تھی۔ عام طور پر انسان دوسروں کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتا اور ان کی خوشحالی پر جلتا اور کڑھتا تھا۔

۳۔ حلال و حرام کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ مردے، خون اور سور جیسی غلیظ اور مضر چیزیں بے تکلف کھائی جاتی تھیں۔ جوئے بازی، شراب نوشی اور زنا کاری عام تھی۔ یہ بدکاری علانیہ اور فخریہ کی جاتی تھی۔

۴۔ نکاح و طلاق کے معاملات میں شرافت اور فطری تقاضوں کو پامال کر ڈالا گیا تھا۔ بیویوں کی تعداد کے لیے کوئی حد تھی نہ ان کے ساتھ انصاف ضروری۔ لڑکا اپنی سوتیلی ماں سے شادی

کر لیتا تھا۔ بیوی کے ساتھ سالی بھی نکاح میں رکھ لی جاتی تھی۔ ایران میں مزدکیت کے اثر سے سگی بہن، ماں، بیٹی، پھوپھی وغیرہ تک سے شادی کر لی جاتی تھی۔

۵۔ بیشتر معاشروں میں عورت اپنا مستقل وجود نہ رکھتی تھی اور سارے حقوق سے محروم تھی۔ جانوروں کی طرح بیچی خریدی جاتی تھی۔ شوہر سنگین ترین سزائیں دینے یا زبان سے مار ڈالنے کا بھی مجاز تھا۔ ہندوستان میں عورت کو اس کے وفات یافتہ شوہر کی چتا پر جلا دیا جاتا تھا۔ عرب میں شوہر کی موت کے بعد اس کے بھائی بند اس کی بیوی کے وارث ہو جاتے تھے۔ پھر خود شادی کر لیتے یا جہاں چاہتے بیاہ دیتے، عورت یا اس کے اولیاء مداخلت نہ کر سکتے تھے۔ لڑکی کا وجود رسوائی کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا، اور کتنے ہی بدبخت اپنی بیٹیاں اپنے ہاتھوں زندہ گاڑ آتے تھے۔

۶۔ سود خواری کی لعنت چار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ تجارت میں بے جا نفع خوری کے لیے خرید و فروخت کے عجیب عجیب پر فریب طریقے رائج تھے۔

۷۔ یتیموں کا مال عموماً ہڑپ کر لیا جاتا تھا، خیانت کوشی عیب نہ تھی، مالدار لوگ محنت کشوں، مزدوروں اور دستکاروں کی اجرت مار رکھتے تھے۔ روم و فارس میں بڑی بڑی زمینیں جوتنے بونے والا کسان نان شبینہ کو ترستا تھا اور ان زمینوں کے مالک یا جاگیردار اپنے سر پر کئی کئی لاکھ کا تاج رکھتے تھے۔ ہر طرف طاقتور کمزور کا خون چوس رہا تھا۔ اس سے بیگار لینا، اس کا مال دبا لینا اور اس کے حقوق غصب کر لینا معمولی بات تھی۔ درحقیقت کمزور ہونا ہی تباہی و بربادی کو دعوت دینا تھا۔ عرب شاعر کہتا ہے:

ومن لا یذد عن حوضہ وسلاحہ

یھدم ومن لا یظلم الناس یظلم

"جو شخص اپنے ہتھیار سے اپنے حوض کی حفاظت نہ کرے گا اور جو لوگوں پر ظلم نہ کرے گا اس پر خود ظلم کیا جائے گا۔"

۸۔ انسان کو بحیثیت انسان کوئی حق حاصل نہ تھا۔ نہ جان محفوظ تھی نہ مال نہ آبرو۔ حکومت یا قبائل کی جو محدود اکائیاں تھیں، ان سے باہر کا آدمی بے تکلف لوٹ لیا جاتا یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ اپنی اکائی کے آدمی کی بھی حفاظت اس لیے نہ کی جاتی تھی کہ وہ انسان ہے بلکہ اس لیے کہ یونٹ کو اپنے گوناگوں مقاصد کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ ایران میں مزدکی منطق نے باہم بھی

ایک دوسرے کی جان و مال اور آبرو مباح کر دی تھی۔

۹۔ معاشرے میں امن و استقرار کے بجائے بدامنی، قتل و غارت گری، رہزنی، حبس بیجا، تصرف ناجائز اور مداخلت بے جا کا دور دورہ تھا اور اس کی بنا پر معیشت پامال اور لوگ بدحال تھے۔ فقر و فاقہ اس حد تک پھیلا ہوا تھا کہ بہت سے افراد فقر کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔

۱۰۔ حکام جبر و قہر سے عبارت تھے، رعایا کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے لہو نچوڑ کر حکام کی عیش کوشی کا سامان فراہم کرے اور خود لقمۂ عیش کے لیے ترستی رہے۔ ظلم و جور اور جبر و قہر کے خلاف آواز اٹھانا تو درکنار شکوہ کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ اس بارے میں قبائلی وحدتوں کا حال بڑی بڑی حکومتوں کے بالمقابل نسبتاً اچھا تھا۔

۱۱۔ بدامنی اور خطرات کی ہمہ گیری نے افراد کے اندر اپنے اپنے قبیلوں کے لیے حد درجہ تعصب پیدا کر دیا تھا جس کی آمیزش سے نسلی غرور و تفاخر کے جذبات دو آتشہ اور سہ آتشہ ہو گئے تھے۔ آدمی یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی جھگڑے میں اپنے بھائی کی مدد کرنے کے بجائے غیر جانبداری اور انصاف سے کام لے، ان میں ایک مثل رائج تھی انصر اخاک ظالما او مظلوما اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی اپنے قبیلے کا ساتھ دیتے تھے کہ ہمارا قبیلہ غلطی پر ہے، ان کا شاعر کہتا ہے:

وما انا الا من غزیۃ ان غوت

غویت وان ترشد غزیہ ارشد

"میں بھی قبیلہ غزیہ ہی کا ایک فرد ہوں، اگر غزیہ غلط راہ پر جائے گا تو میں بھی غلط راہ پر جاؤں گا اور اگر غزیہ صحیح راہ پر جائے گا تو میں بھی صحیح راہ پر جاؤں گا۔"

۱۲۔ تعصب اور تکبر نے ایک طرف نوحہ خوانی اور نسلی غرور کی شاعری کو جنم دیا تھا، تو دوسری طرف اس جذبے کے تحت نہایت حقیر اور معمولی معمولی باتوں پر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے، پھر صدیوں تک نہیں بجھتے تھے۔

بنو وائل کے دو برادر قبیلوں بکر اور تغلب میں ایک چراگاہ کے اندر دوسرے کے اونٹ کے چلے جانے پر جنگ بسوس برپا ہوئی تو چالیس برس تک اس کا سلسلہ نہ ٹوٹا

اور فریقین کے ستر ہزار آدمی اس کا ایندھن بن گئے۔ بنو قیلہ کے دو برادر قبیلوں اوس اور خزرج میں جنگ چھڑی تو ڈیڑھ صدیوں تک کشت وخون کا سلسلہ چلا۔

۱۳۔ جنگ کسی خاص مقصد کے لیے نہیں بلکہ جذبۂ تکبر، جوشِ انتقام یا محض لوٹ کھسوٹ کے لیے لڑی جاتی تھی اور جنگ کے لیے کوئی اصول وضابطہ نہ تھا بلکہ جنگ کا مفہوم تھا تخریب وتباہ کاری اور وحشت وبربریت کا طوفان۔ جنگ میں کھیتیاں باغات، مکانات وغیرہ پامال، برباد اور نذرِ آتش کر دیے جاتے تھے۔ مقاتلین کے علاوہ بوڑھوں، بچوں، عورتوں، مجبوروں، ضعیفوں اور بے تعلق لوگوں کو بھی بے دریغ تہ تیغ کر دیا جاتا تھا۔

۱۴۔ قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک ہوتا تھا اور رومن امپائر اس سلسلے میں سب سے بازی لے گیا تھا۔ یہاں قیدیوں کو شیروں اور درندوں سے پھڑوا دیا جاتا تھا۔ مگرمچھ کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ بیل گاڑیوں اور رتھوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے اور چڑھاتے ہوئے کھچوایا جاتا اور اس کے درمیان قیدی کو کچل دیا جاتا۔ جلتے ہوئے تیل میں زندہ بھون دیا جاتا۔ ٹکٹکی باندھ کر بانس کے کریلے پر زندہ لٹا دیا جاتا اور وہ کریلا راتوں رات ناف اور پیٹ چیر کر آر پار ہو جاتا۔

خلاصہ یہ کہ انسانی زندگی کا ایک ایک گوشہ گمراہی بے اعتدالی اور مصائب کی زد میں آچکا تھا اور انسان شدید گمراہی ظلم ومایوسی اور حرماں نصیبی کے لق ودق صحرا میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اس تیرہ وتار فضا میں اگر کہیں کسی خیر کا وجود تھا بھی تو اس کی حیثیت جگنو کی چمک سے زیادہ نہ تھی۔

ان حالات میں ۲۱ رمضان المبارک ۴۱ عام الفیل مطابق ۱۰ اگست ۶۱۰ء شب دوشنبہ کو کوہِ حرا کے ایک غار میں سعادت انسانی کا جلوہ ظاہر ہوا۔ حضرت جبریل امین یکایک نازل ہوئے اور ہمارے نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دبوچ کر رب اکرم کے نام سے پڑھنے کی وحی فرمائی۔ دس دن بعد جب آپؐ کے قوای معنوی آنے والی کتاب کی مطلوبہ قرأت کے لیے مستعد اور مشتاق ہو چکے تھے تو یکم شوال کو جبریل امین پھر نمودار ہوئے۔ اب کی بار وہ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر جلوہ افروز تھے انہیں دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم مرعوبیت میں گھر آئے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔

اتنے میں حکم الٰہی آیا:

"یاایہا المدثر قم فانذر - الآیۃ"

"اے کمبل اوڑھنے والے اٹھ اور لوگوں کو ان کے خطرناک انجام سے آگاہ کر دے۔"

پھر کیا تھا؟ آپ کمبل پوشی کا سکون تج کر اُٹھ پڑے اور پھر اٹھے ہی رہے۔ عمر شریف کے باقی ماندہ تئیس برس اس رزم گاہِ حیات اور کشاکشِ حق و باطل میں گزار دیے اور اس قوت کے ساتھ کہ اس کرۂ آب و گل کے لیل و نہار بدل گئے۔ شرک و کفر کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی اس دنیائے تیرہ و تار کے بیچوں بیچ آفتابِ حق و صداقت اپنی پوری تب و تاب کے ساتھ دمک اٹھا جس سے پہاڑوں اور ٹیلوں کی چوٹیاں ہی نہیں، زمین کے نشیب اور وادیاں بھی روشن ہو گئیں اور واشرقت الارض بنور ربہا کا سماں بندھ گیا۔ اہل توحید کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس کے جلال حق کے سامنے دیکھتے دیکھتے دنیا سپر انداز ہو گئی اور جہاں ان کے قدم نہ پہنچ سکے وہاں ان کے مشعل کی روشنی پہنچی۔ اس طرح بنی نوع انسان کے لیے سعادتِ کبریٰ کا دروازہ کھل گیا۔

اس سعادت کا آغاز اسی مرکزی نقطے کی اصلاح سے ہوا جس کی خرابی سے ہمہ گیر فساد کا سیلاب پھوٹا تھا اور جس کی اصلاح کے بغیر آج بھی شر و فساد پر قابو پانا ممکن نہیں۔ لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولہا۔ اس امت کا آخر بھی اس چیز سے سدھر سکے گا، جس سے اس کا اول سدھرا تھا۔

یہ اصلاح خدا کی راہنمائی اور اس کی نگرانی میں ہو رہی تھی، اس لیے اس کے ہر قدم میں حکمتِ الٰہیہ کارفرما تھی، اس حکمت کا تقاضا تھا کہ سب سے پہلے "جڑ" پر ضرب لگائی جائے کہ اس کے بعد شاخیں بآسانی تراشی جا سکتی ہیں اور اگر تراشی نہ بھی گئیں تو رفتہ رفتہ خود ہی سوکھ کر مردہ ہو جائیں گی۔ چنانچہ سب سے پہلے توحید کی تعلیم دی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین خطاب یہ ہوا کرتا تھا:

"ایہا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا"

"لوگو یہ کہو کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، کامیاب ہو جاؤ گے!"

چار لفظوں پر مشتمل یہ مختصر سا فقرہ جسے کامیابی کی کلید قرار دیا گیا ہے۔ درحقیقت اپنے اندر معنویت کی ایک دنیا اور انقلاب کا ایک طوفان لیے ہوئے ہے جس کی تفصیلات کی ہمہ گیر تصویر کشی سخت مشکل ہے۔ چند اشارے پیش خدمت ہیں:

(ا): اس کا اوّلین اور ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ایک مان کر صرف اور صرف اسی کی عبادت کی جائے اور وہ سارے اعمال جنھیں مراسم عبادت شمار کیا جاتا ہے کبھی بھی غیر اللہ کے لیے نہ بجا لائے جائیں کیونکہ الوہیت کے اوصاف اللہ کے سوا کسی اور میں نہیں ہیں۔ بلفظ دیگر کسی بڑی سے بڑی ہستی میں اسباب و مسببات کی دنیا سے بالاتر ہو کر کوئی ایسی معنوی قوت نہیں ہے کہ وہ ذرہ برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے اور کسی کی حاجت روائی و مشکل کشائی کر سکے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساری امیدیں بھی صرف اللہ ہی سے وابستہ کی جائیں۔ بھروسہ اور توکل بھی صرف اسی پر کیا جائے اور ڈر اور خوف بھی صرف اسی کی پکڑ اور گرفت سے کیا جائے۔ نیاز مندانہ محبت بھی صرف اسی سے وابستہ کی جائے اور ان سارے معاملات میں انسانوں کی تمام خود ساختہ موہوم ہستیوں سے اپنے آپ کو مکمل بے تعلق، بے نیاز اور بے خوف کر لیا جائے۔ خدا اور بندے کے درمیان مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ربط و تعلق کی یہ وہ صحیح ترین بنیاد ہے، جس کے بغیر نہ انسان کی روح آسودہ ہو سکتی ہے۔ نہ وہ تاریکیوں اور نامرادیوں کے لق و دق صحرا میں بھٹکنے اور در بدر کی ٹھوکریں کھانے سے نجات پا سکتا ہے ؎ وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(ب) اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اس کلمے سے بندے اور خدا کے درمیان مقدس ہستیوں کے وسیلے اور واسطے کا سارا معاملہ ہی ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا پنڈتوں، مہنتوں، مجاوروں، سجادہ نشینوں، پیروں اور راہبوں وغیرہ نے دینی اجارہ داری کا جو جال بُن رکھا تھا اور مختلف ہستیوں کے حاجت روائی اور مشکل کشائی کرانے کے نام پر آستانوں کے نام پر نذر و نیاز کی وصولی کے جو مراکز قائم کر رکھے تھے اس کے تار و پود خود بخود بکھر گئے۔ انسان اس پھندے سے نکل کر خدا کے ساتھ صحیح تعلق اور خدائی رہ نمائی کی وسیع اور صاف شفاف فضا میں سانس لینے لگا۔ اسلام نے اس غلط، گمراہ کن اور سراسر استحصال پر مبنی مذہبی اجارہ داری کی جڑ اس طرح کاٹی کہ اس کا ایک ریشہ بھی باقی نہیں رہنے دیا ــــ قرآن نے وضاحت کی ہے، خالق صرف اللہ ہے

اس لیے حکم بھی اسی کا چلے گا اور اس نے اپنی شریعت اور اپنی مرضیات کی وحی کے لیے صرف پیغمبر کو منتخب کیا ہے کسی اور کو نہیں اور پھر اپنے پیغمبرؐ پر اپنا پورا دین مکمل کر دیا ہے۔ لہٰذا اب اس میں ترمیم واضافے اور پیوند کاری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خود پیغمبر کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ اپنی مرضی اور صوابدید سے کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دیں یا اس کے کسی اور حکم میں کسی طرح کی تبدیلی کر دیں۔ کفارِ مکہ نے قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ کیا تو حکم ہوا:

"قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائ نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی۔"

"آپ کہہ دیں مجھے اپنی مرضی سے تبدیلی کرنے کا کوئی اختیار نہیں، میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جس کی وحی میرے پاس کی جاتی ہے۔"

اس طرح انسانوں کے ہاتھ سے شریعت سازی کے سارے اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ رہ گیا کہ وہ اللہ کی شریعت معلوم کر کے اس پر عمل پیرا ہوں اور دوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کریں اور تبلیغ بھی طلب دنیا کے لیے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کیلیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا "قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلفین" "آپ کہہ دیں کہ میں اس پر نہ تم سے کوئی اجر مانگتا ہوں اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں" طلب اجرت سب سے کم اور معمولی درجے کی خود غرضی ہو سکتی تھی، لیکن اسے بھی ختم کر دیا گیا۔

ج: یہیں سے اس کلمے کا ایک اور تقاضا سامنے آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حق الوہیت یہ ہے کہ حکم وہی دے سکتا ہے اور اس میں پیغمبر تک کو دخیل ہونے کا حق یا اختیار نہیں دیا گیا ہے تو بندے کی بندگی کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کر دے اور اپنے تمام شعبہ ہائے حیات میں بلا چون وچرا اس کی اطاعت کرے اور اسی کی مرضی کے تابع ہو جائے۔ اس کی اجازت کے دائرے سے باہر نکل کر نہ کسی کی اطاعت کرے اور نہ کسی کی مرضی کا طلبگار ہو۔

یہ ہے اپنے بعض لوازم سمیت وہ مرکزی نقطہ جس پر دورِ جاہلیت کے بگڑے ہوئے انسان کی اصلاح کی بنیاد رکھی گئی، یہ محض ایک تحریکی نظریہ نہ تھا، بلکہ یہ ایمان وعقیدے

کی بات اور اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کی یافت تھی، اس لیے جب پیغمبرانہ تربیت کے ذریعے اسے دل کی گہرائیوں میں اتارا گیا تو اندازِ فکر سے لے کر کردار و عمل تک کی ساری دُنیا ہی بدل گئی۔ نوعِ انسانی کے کمالات اور خیر و برکت کے عجائبات ظہور میں آئے اور سرِ عام ان باتوں کے وجود و نمود کا ہنگامہ مچ گیا جنھیں انہونی اور محال سمجھ لیا گیا تھا۔ اس عقیدے کا اگر ایک کرشمہ یہ تھا کہ جبر و ظلم کی کوئی سنگین سے سنگین صورت حتیٰ کہ آگ کے دہکتے ہوئے انگارے بھی انسان کے پائے استقامت میں تزلزل نہ لا سکے تو دُوسرا کرشمہ یہ تھا کہ وہی انسان جو برائیوں پر فخر کرتا تھا اب برائیوں سے اپنی پاکی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے اور وہی انسان جو دوسروں کو لوٹ کر اپنی ہوس زرگری کو تسکین دیتا تھا، اب وہی انسان دوسروں کے لیے اپنا سب کچھ لٹا کر آسودگی اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ وہی انسان جس کے قبائلی تعصب اور ہٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے مقررہ آداب و رسوم اور عادات کے خلاف صرف ایک لفظ سن کر تلوار کھینچ لیتا تھا اب اس درجہ روادار اور معقول ہو چکا ہے کہ صرف ایک شخص کی ایک غائبانہ اور نامعلوم آواز سن کر شراب کا مٹکا خود اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے پتھر کے اس پیالے سے توڑ دیتا ہے جسے شراب سے بھر کر پینے جا رہا تھا۔

ایسے مستحکم ایمان اور ایسے ٹھوس جذبۂ اطاعت کے بعد اس انقلاب کو برپا کرنا عین ممکن ہو گیا جو جمعیتِ انسانی کی سعادت کے لیے مطلوب تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ایمان نے اس انقلاب کے لیے ایک لگن اور تڑپ پیدا کر دی اور اس راہ کی ہر صعوبت کو لذت میں بدل دیا۔ اہل ایمان کو بتلایا گیا کہ سارے اعمال کی روح تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن ہے، یعنی جو قدم بھی اٹھے اس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو۔ اپنی ذاتی غرض اور مفاد مطلوب نہ ہو اور ایسا بھی نہ ہو کہ اللہ کے دین کی سربلندی کے جوش میں کوئی ایسا قدم اٹھا دیا جائے جو بذاتِ خود بُرا ہے۔ بلفظ دیگر مقصد بھی پاکیزہ ہو اور وسائل بھی پاکیزہ ہوں۔

اس پاکیٔ نفس کو انسان کے سارے اعمالِ خیر کی روح قرار دے کر انسان کی قوتِ تمیز کو دعوتِ فکر دی گئی۔ انسان درحقیقت ایک اخلاقی شعوری مخلوق ہے اور اس میں تمیز خیر و شر کی فطری صلاحیت ہے، انسان کی اسی صلاحیت کو بیدار کیا گیا اور اس کے اخلاقی شعور کے ہاتھ میں اس کی زمام کار دے کر اسے صراطِ مستقیم پر چلا دیا گیا۔ وحیِ الٰہی اور ارشاداتِ رسولؐ کی روشنی اس کی راہ نمائی کرتی رہی۔ اس کے نتیجے میں جو تبدیلی عمل میں آئی، اس کے موٹے موٹے نقوش یہ ہیں۔

۱۔ خدا اور بندے کے درمیان صحیح ربط قائم ہوا، جس پر ساری سعادتوں کا دارومدار ہے۔

۲۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی وغیرہ کی شکل میں عبادتِ الٰہی کا جامع معقول اور شرفِ انسانی کے شایانِ شایان طریقہ رائج ہوا۔

۳۔ تہذیب نفس اور صفائے باطن کی فضا عام ہوئی۔

۴۔ مکارم اخلاق کی تکمیل ہوئی، لوگ کردار کی پستی سے نکل کر شرافت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ جھوٹ، فریب، خود غرضی اور بدعہدی ایسا گھناؤنا جرم بن گیا کہ ایمان کے سانچے میں ڈھلا ہوا انسان ان کے قریب پھٹکنے کے بجائے جان دینا پسند کرنے لگا۔ اکا دکا افراد جو اس طرح کی خامیوں میں مبتلا تھے، منافق قرار پائے اور انہیں سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ غرور و تکبر ناپید ہوا۔ ایک دوسرے کی عزت و قدر اور ہمدردی و غمگساری عام ہوئی۔ اخوت، بھائی چارگی اور انسانیت دوستی و انسانیت نوازی کے عجائبات ظہور میں آئے۔ مومن کا بازو حق پرستوں کے لیے انتہائی نرم اور باطل کے مقابل میں فولاد کی چٹان بن گیا۔ یعنی ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

۵۔ خیر و شر اور حلال و حرام کی تمیز عام ہوئی۔ خبیث اور گندی چیزیں جن سے جسم فاسد ہوتا ہو، مثلاً سور اور کتے یا عقل جاتی رہتی ہو مثلاً شراب اور نشہ آور چیزیں یا دین فاسد ہوتا ہو، مثلاً غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوے جانور — ان تینوں اقسام کو حرام کیا گیا۔ طیبات یعنی پاکیزہ چیزیں حلال ٹھہرائی گئیں۔

۶۔ معاملات کی بنیاد نصح و خیر اہی پر رکھی گئی ہے اور لین دین میں جواز و عدم جواز کی یہی بنیاد قرار پائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف سامان بیچنے والا پہلے اپنے سامان کا عیب دکھلاتا پھر بتلاتا کہ اس عیب کی وجہ سے اس کی قیمت عام بھاؤ کے مقابلے میں اتنی کم کردی گئی ہے۔ دوسری طرف خریدار اصرار کرتا کہ قیمت کچھ زیادہ لو، بہت کم لے رہے ہو۔ مزدور، صنعت کار اپنے استحقاق سے کچھ زیادہ ہی اجرت پانے لگے اور وہ بھی پیشانی کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ہی۔ معاشرہ غریبوں، مجبوروں، معذوروں وغیرہ کا کفیل بن گیا۔ سود خواری کی لعنت جڑ سے ختم ہوگئی اور مختلف امکانات ترقی کے دروازے کھل گئے۔

۷۔ جنسی تعلقات کے سارے نامعقول طریقوں کا خاتمہ ہوگیا اور نکاح و طلاق کے ضابطہ

معقولیت و شرافت اور تقاضائے عدل و فطرت کے دائرے میں لایا گیا۔

۸۔ عورت جو مرد کا پیوند سمجھی جاتی تھی اسے مستقل حیثیت دی گئی۔ عبادت سے لے کر حق ملکیت اور مالکانہ تصرفات تک کے جملہ ذاتی امور میں اسے مرد کے مساوی قرار دیا۔ شوہر کے انتخاب اور عقد کے نفاذ کا آخری اختیار اور فیصلہ اسی کے ہاتھ میں دیا گیا۔ خلع کی شکل میں ظالم شوہر کے پنجے سے نکلنے کی راہ کھولی گئی۔ خاندان، سماج اور حکومت کو عورت کے منصفانہ حقوق کا ضامن بنایا گیا اور اس کی کفالت کی مستقل ضمانت فراہم کر کے اسے فکرِ معاش سے آزاد کر دیا گیا اور اس کے باوجود اسے وارث قرار دیا گیا اور اس کی مقدار استحقاق میں فیاضی سے کام لیا گیا۔ عورت کے وجود کی جسمانی اور معنوی ساخت فطری طور پر جس قسم کی حفاظت کی طلبگار تھی اُسے وہ حفاظت فراہم کی گئی اور اسے انسانی سماج کی نوع بنوع ذلتوں اور رسوائیوں کے گرداب سے نکال کر عزت و احترام اور قدر و منزلت کے مقام پر فائز کیا گیا۔

۹۔ انسان کی نہ صرف یہ کہ جان، مال اور آبرو کی ضمانت دی گئی بلکہ اس کے وہ تمام حقوق بحال کئے گئے جنھیں انسان کی فطرت اپنی انسانی حیثیت میں چاہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے حقوق انسانی کا ایک ایسا معیار پیش کیا ہے جس کی نظیر آج تک کسی دوسرے معاشرہ میں وجود میں نہ آسکی۔

۱۰۔ حقوقِ انسانی کی اس بحالی و حفاظت کے نتیجے میں امن و امان کا ایسا دور دورہ ہوا کہ وہی عرب جس کا چپہ چپہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مقتل بنا ہوا تھا، اب اسی عرب میں ایک ہودج نشین خاتون جواہرات کے انبار لے کر تن تنہا حیرہ سے چلتی اور کئی ہزار میل کا راستہ طے کر کے صنعا پہنچتی ہے مگر راستے میں اسے کسی خطرے کا اندیشہ تک نہ ہوتا۔

۱۱۔ حکومت کی بنیاد اجتماعی عدالت کے اعلیٰ ترین معیار پر قائم ہوئی جو خدمتِ خلق اور حفاظتِ حق سے عبارت تھی، انصاف اس درجہ تھا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اعلان کرتے ہیں:

"واللہ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا"

"اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ لوں گا"

خلیفۂ اوّل اعلان کرتے ہیں کہ تمہارا کمزور میرے نزدیک طاقتور ہے، جب تک کہ اس کا حق نہ دلا دوں اور طاقتور کمزور ہے جب تک کہ اس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں۔ خلیفۂ دوم اپنے بیٹے کی پیٹھ پر اپنے ہاتھ سے کوڑے لگاتے ہیں اور وہ بھی اس بنا پر کہ دوسرے سزا دینے والے نے خلیفہ کا بیٹا ہونے کے ناتے رعایت کر دی تھی۔ ایک گنوار کی شکایت پر عمرو بن عاص جیسے جانباز کمانڈر کے بیٹے کی پیٹھ کوڑوں کی زد میں آجاتی ہے اور اس سوال کے ساتھ کہ:

"متی استعبدتم الناس وقد ولدتہم امہاتہم احرارا"

"تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنالیا حالانکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا"

بارگاہِ اسلام علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلیفۂ وقت ہوتے ہوئے قاضی کی عدالت میں ایک یہودی چور کے مقابل بیٹھتے ہیں اور یہودی کو ڈگری حاصل ہوتی ہے۔ یہ چند مستثنائی مثالیں نہیں ہیں۔ پورا معاشرہ اسی انصاف کے ڈھانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔

۱۲۔ نسلی غرور اور قبائلی کشاکش کا اس حد تک خاتمہ کر دیا گیا کہ جو قبائل ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے۔ اب وہی ایک دوسرے کے محافظ بن گئے اور جو لوگ اپنے بالمقابل ساری دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اب وہی لوگ ایک معمولی غلام زادے کی امارت و سیادت میں اس کی رکاب پکڑ کر پیدل دوڑتے ہوئے بھی عار محسوس نہیں کرتے۔

۱۳۔ اسی طرح جنگ کے غیر اخلاقی اسباب کا خاتمہ کر کے اسے انسان اور انسانیت سے متعلق نہایت اعلیٰ مقاصد کے اندر محدود ہو کر دیا گیا۔ قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ کا جامع مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے صرف تین مقاصد کے لیے جنگ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ تبلیغِ دین سے روکا جائے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ اسلام لا چکے ہیں انہیں ستایا جائے اور سختی اور تعذیب کے ذریعہ اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جو لوگ اسلام کی طرف مائل ہیں۔ ان کے سامنے ایسی مشکلات کھڑی کی جائیں

کہ وہ مسلمان ہونے کی ہمت نہ کر سکیں۔

پھر جنگ کے غیر اخلاقی اسباب کی طرح اس کے غیر اخلاقی کردار کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ یعنی جنگ میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں اور غیر متعلق لوگوں کو قتل کی اجازت نہیں دی گئی۔ صرف مدِ مقابل آنے والے برسرِ پیکار شخص کو قتل کرنا روا رکھا گیا۔ مکانات، باغات، املاک اور کھیتیاں وغیرہ جلانے اور تباہ کرنے سے روک دیا گیا۔ صرف بعض مخصوص حالات میں جنگی مقاصد کے لیے بعض محدود املاک کو نقصان پہنچانے کی اجازت دی گئی۔

۱۴- اسیرانِ جنگ کو ان کے بھیانک انجام سے بچا لیا گیا، ان کے ساتھ سختی اور تعذیب کے بجائے حسنِ سلوک کی روش اپنائی گئی۔ مجرمین جنگ کے علاوہ کسی قیدی کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ یا تو بلا معاوضہ معاف کر دیا گیا، یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا، یا قیدیوں سے تبادلہ کیا گیا یا غلام بنا کر معاشرے کا ایک جزو بنا لیا گیا۔

خلاصہ بحث یہ کہ انسان جب خدا پرستی کی راہ یعنی صراطِ مستقیم سے ہٹا تو اس کی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ اور شعبہ نہ تھا جو گندگی میں ملوث نہ ہوا ہو اور جہاں اسے اذیت اور غیر فطری مشکلات میں بھٹکنا نہ پڑا ہو لیکن جب اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس برس کی مسلسل تگ و دو، ہدایت و راہنمائی اور ارشاد و تربیت کے ذریعہ صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا اور اس کے ہاتھ میں قرآن مجید اور سنتِ نبویہ کی مشعل تھما دی تو خدا پرستی، تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہ بچا جو اس کے لیے مفید اور اس کی فطرت کے عین مطابق نہ بن گیا ہو۔

یہ ہے اس عظیم و بے نظیر انقلاب کی ایک ہلکی سی جھلک جو پیغمبر اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ کار اور عظمتِ کردار کی آئینہ دار ہے اور جس کی تہ سے حیاتِ انسانی کے چشمے ابلتے ہیں۔ آج بھی آپ کی سیرت و کردار کا یہ تابناک پہلو معاشرۂ انسانی کے لیے اس بات کی سراپا دعوت ہے کہ اگر اسے نجات و فلاح اور سعادت و سیادت مطلوب ہے تو وہ اسی نقشِ پاکی پیروی کرے، اور خدا کا بندہ بن کر بزمِ کائنات کی صدر نشینی کے اپنے صحیح منصب و مقام کو اپنا لے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

بشکریہ محدث بنارس